© rasailojaraid.com

تعارفِ کتب

(عبدالحمید)

راہنمائے فسقِ جدید (A GUIDE TO MODERN WICKEDNESS) تالیف پروفیسر سی۔ ای۔ ایم جوڈ۔ مطبوعہ فیبر اینڈ لمیٹڈ رسل سٹریٹ لندن۔ صفحات ۲۹۱۔

پروفیسر جوڈ مشرق و مغرب کے علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُس نے اگرچہ دنیا کے سامنے کوئی نیا فکر پیش نہیں کیا مگر رائج الوقت افکار کی جس خوبی اور ذہانت کے ساتھ تشریح و تنقیح کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ اُس کا دماغ شروع سے آخر تک انسان اور اس کے متعلقہ مسائل کو سوچنے میں مصروف رہا۔ اس کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں کئی تغیرات پیدا ہوئے۔ اُس نے مسیحیت کو خیرباد کہہ کر دہریت اور مادیت کو اختیار کیا مگر یہاں بھی اطمینان نصیب نہ ہو سکا اور آخر کار پھر مذہب کی آغوش میں پناہ لینا پڑی۔

زیرِ نظر کتاب اُس کے اس آخری دور کی ترجمان ہے۔ اس کا آغاز اس حقیقت سے کیا گیا ہے کہ دنیائے اخلاق میں چند ایسی مستقل اور پائیدار اقدار ہیں جو زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ نہیں بدلتیں۔ مارکسی طرزِ فکر نے ان معروضی قدروں کی نفی کر کے انسانیت کو ایک عظیم نقصان پہنچایا ہے۔ اب ہر فرد اور گروہ کے نزدیک نیکی وہ ہے جس سے اُسے مادی فائدہ حاصل ہو سکے، اور برائی وہ جس کے اختیار کرنے سے اُسے دنیاوی فوائد و لذائذ سے محروم ہونا پڑے۔ اخلاق کی معروضی اقدار کے ثبوت میں اُس نے ایک دلیل بھی دی ہے وہ لکھتا ہے:۔

"فرض کیجیے آپ کے پاس کوئی شخص آکر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کونین مفید ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں مفید ہے؟ جواب ہے یہ بخار کو اتارتی ہے لیکن آخر ہم کیوں چاہتے ہیں کہ بخار سے ہمیں نجات حاصل ہو۔ اس لیے کہ بخار بیماری ہے۔ بیماری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے انسان کیوں بچتا ہے۔ کیونکہ تندرستی بیماری سے بہتر ہے۔ پھر سوال کیا جا سکتا ہے کہ تندرستی بیماری سے کیوں بہتر ہے۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ہم اسے ایسا پاتے ہیں؟

اگر ہم اس طرح سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیں تو آخر کار ہم مجبوراً ایک ایسا نقطہ یا مقام پر جا کر رک جائیں گے جہاں مزید سوال و جواب کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہمیں زندگی کے لیے چند علمی اور عملی اقدار کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ احساس اہمیت اور اس کا نامکمل ادراک وہ اصل مفروضات ہیں جن پر نسل انسانی نے اپنے مقصد کا قصر تعمیر کیا ہے۔ یہ عقیدہ اتنا بنیادی اور فطری ہے کہ انسان نے کبھی بھی اس میں شک نہیں کیا۔ ڈیکارٹ اور ہیوم کی طرح جس کسی نے اس سمت میں قدم اٹھایا اسے بالآخر شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

پروفیسر جوڈ نے چونکہ اپنا طرزِ استدلال اہل مغرب سے مستعار لیا ہے اس لیے وہ اخلاق کی معروضی قدروں کے متعلق کوئی بات پورے وثوق اور یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکا۔ اگر وہ قرآن پاک کی ایک آیت (اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) پر غور کرتا تو فکر و نظر کے بہت سے گوشے اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتے۔ قرآن مجید اپنے دعویٰ کا آغاز اس حقیقت سے کرتا ہے کہ ایک علیم و خبیر ہستی پوری حکمت اور تدبر سے اس کارخانۂ حیات کو چلا رہی ہے۔ دوسرے نسل انسانی شعوری یا غیر شعوری طور پر خالق کائنات کے ارادہ کے ساتھ اپنے عزائم کو ہم آہنگ کرنے کی سعی کرتی ہے۔ یہی جذبہ اس کے افعال کا اصل محرک ہے۔ اس جذبہ یا اسی خواہش پر نسل انسانی کا معیارِ خیر و شر قائم ہے۔ جب تک ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ ساری کائنات اور اس کی تمام حرکات ایک خالق مطلق کی کرشمہ سازی ہے اس وقت تک ہمارا کوئی مقصد یا عمل لازمی طور پر اچھا یا برا نیک یا بد ٹھہرایا نہیں جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں ایک زندہ و جاوید خدا پر ایمان اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم اس کے پیش کردہ معیارِ خیر و شر کو ہی قبول کریں۔

اس کے علاوہ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذاتِ مطلق اور اس کی صفاتِ کمال موجود ہیں تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ اس حقیقت کا اقرار ہے کہ وہ ہماری ذات سے جداگانہ اپنا ایک الگ اور مستقل وجود رکھتی ہے۔ اس کا وجود نہ تو کسی مخصوص معاشرتی ماحول یا معاشی احوال کا محتاج ہے اور نہ ہمارے اقرار کا دست نگر۔ جس طرح خداوند تعالیٰ غیر فانی ہے اسی طرح اُس کی پیش کردہ اقدار بھی ازلی و ابدی ہیں۔ ان کی حیثیت "مرغِ بادنما" کی نہیں جو واقعات کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنی سمت کو بدلتی رہیں۔ بلکہ اُن کی حیثیت اُس بے لاگ عدالت کی سی ہے جو ازل سے ابد تک قائم ہو، جو ہر دَور اور ہر مقام پر ہر قسم کے خارجی حالات میں لوگوں کو ان کے افکار و اعمال کے متعلق صحیح فیصلہ دے۔ یہ "عدالت" نہ تو ہمارے ذہن کی پیداوار ہے نہ ہمارے معاشی ماحول کا کرشمہ۔ اس کی اپنی الگ اور مستقل حیثیت ہے۔ انسانیت نے اگرچہ تہذیب و تمدن کے بیشمار چولے بدلے ہیں مگر ایک لافانی خدا کے لازوال اصول اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ وہ اَن مِٹ اور اَٹل ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت جس کو منضبط کرنے کے لیے اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے ان کو وضع کیا ہے وہ آج بھی وہی ہے جو سینکڑوں ہزاروں سال پیشتر تھی۔ انسانی فطرت جن ناقابلِ تغیر خصوصیات پر مبنی ہے وہ امتدادِ زمانہ اور تغیر کے باوجود یکساں اور غیر مبدّل ہے۔ اس لیے خدا کے پیش کردہ ان غیر تبدّل پذیر اور دائمی حقائق پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس ضمن میں ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ذاتِ مطلق اور صفاتِ کمال کا تصور ایک ایسا لازمی تصور ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ ہمارا کوئی فکری عمل ایسا نہیں ہو سکتا جو مطلق کے تصور سے خالی ہو۔ صداقت کے تصور میں صداقتِ مطلق کا تصور لازماً موجود رہتا ہے۔ اسی طرح اقدار کے تصور میں قدرِ مطلق کا تصور ضرور پایا جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جزوی صداقت یا ناقص اقدار اور بدلتے ہوئے اخلاقی معیار کے تصورات کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایک ایسا تصور موجود نہ ہو جو نہ تو جزوی ہو نہ ناقص اور نہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والا ــــــ چنانچہ ان ابدی حقائق اور مستقل اخلاقی معیار پر ایمان لانے میں ہی انسانیت کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ اس سلسلہ میں مجھے صرف اسی قدر عرض کرنا مقصود ہے کہ فاضل مصنف نے ایک صحیح نقطہ سے آغاز نہ کرنے کی وجہ سے اس مسئلہ کے سارے پہلوؤں کا صحیح طور پر احاطہ نہیں کیا۔ مگر اس کے مخلصانہ غور و فکر نے اُسے اس نتیجہ تک پہنچا دیا ہے کہ یہ مستقل اخلاقی اقدار ہیں صرف مذہب کی بارگاہ سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ پھر اُس نے جس دیدہ وری سے ان اخلاقی قدروں کو نظر انداز کرنے کے خطرناک نتائج سے بحث کی ہے وہ ہر صاحبِ فکر سے ایک گہرے سوچ بچار کا تقاضا کرتی ہے۔ اُس نے ہمیں بتایا ہے کہ اخلاقی انحطاط نے نوعِ انسانی کے لیے اُن ایجادات کو مہلک بنا دیا ہے جن سے نہایت مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ اُس نے بالکل درست کہا ہے :-

"علوم طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی، جو دیوتاؤں کے شایانِ شان تھی۔ لیکن ہم اسے بچوں اور وحشیوں کی طرح استعمال کر رہے ہیں" (ص ۲۶)

ایک دوسرے موقع پر وہ اس حقیقت کا یوں اظہار کرتا ہے :-

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو عظیم تفاوت ہے اس سے ہمیں ہر موڑ پر سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا یہ حال ہے کہ ہم اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کرتے ہیں، سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں لندن کے بڑے گھنٹے (BIG BEN) کی آواز سن سکتے ہیں۔ ٹیلیفون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ بے آواز کے ٹائپ رائٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔ بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جا سکتے ہیں۔ جہازوں میں غسل خانے موجود ہیں۔ کھیتیاں بجلی کی مدد سے پکائی جاتی ہیں۔ ربڑ کی سڑکیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ ایکس رے کے ذریعے ہم اپنے جسم کے اندرونی حصوں کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ تصویریں بولتی اور جاگتی ہیں، لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا سراغ لگایا جاتا ہے، برقی لہروں سے بالوں میں پیچ و خم پیدا کیا جاتا ہے۔ آبدوز کشتیاں قطبِ شمالی تک اور ہوائی جہاز قطبِ جنوبی تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ان سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نزقیمیں یہ۔ باوجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام و حفاظت کے ساتھ کھیلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور بیس ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے تین سو یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا، یا کسی ہوا باز نے ماسکو کی مسافت . . . . مجھے صحیح طور پر یاد نہیں بیس گھنٹہ میں یا پچاس گھنٹہ میں طے کی تھی۔ جب میں یہ سب کچھ کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں پرندوں کی طرح اڑتے ہو، پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو، لیکن ابھی تک تمہیں زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا۔" (ص ۲۶۳)

مصنوعات و ایجادات اپنی جگہ پر بے ضرر اور غیر جانبدار ہیں۔ ان کو برے مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور نیک مقاصد کے لیے بھی۔ اپنی ذات کے اعتبار سے وہ نہ خیر ہیں نہ شر۔ انسان کی تملیکی ذہنیت (ACQUISITIVE MENTALITY) نے انہیں تباہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

"انسان کی اخلاقی قوت کے مقابلہ میں سائنس کی قوت کہیں زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ اولاد آدم کا فطرت پر کنٹرول اس کے لیے ہلاکت انگیز ثابت ہو رہا ہے"

"ہمیں علم طب نے اس امر کی توفیق دی ہے کہ ہم انسانی زندگی کی میعاد بڑھا دیں مگر اس کے ساتھ ہی علم کیمیا نے ایسے آلات بھی ایجاد کیے ہیں جن سے انسانی زندگی کا جلد از جلد خاتمہ کیا جا سکتا ہے"

"ہم بلا شبہ بڑی سرعت تیز رفتاری سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کر سکتے ہیں۔ مگر جن مقامات کا ہم سفر کرتے ہیں وہ بہت کم اس قابل ہیں کہ ان کی طرف سفر کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاحوں کے لیے زمین سمٹ گئی ہے اور کرہ کی طنابیں کھنچ گئی ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قومیں ایک دوسرے کے نزدیک تر ہوگئی ہیں۔ ان کے پاؤں ایک دوسرے کی دہلیز پر ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کے باہمی تعلقات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار ہیں، وہ وسائل جن سے ہم اپنی ہمسایہ قوموں سے براہ راست واقف ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے الٹا دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ ہم نے آواز پہنچانے کا آلہ ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ اپنی ہمسایہ قوموں سے باتیں کیں لیکن اس کا انجام یہ ہے کہ آج ہر قوم ہوا کے سارے وسائل کو صرف اپنی ہمسایہ قوم کو زک پہنچانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہتی ہے کہ دوسری قوم کو اپنے سیاسی نظام کی برتری کا قائل کر دے۔" (صـ ۲۴)

"ذی عقل اور کوتنے کے درمیان تفاوت کی ایک اور نشانی ہوائی جہاز ہے آپ نے فضائے آسمانی میں اڑتے دیکھ کر تمہیں خیال ہوگا کہ اس کے موجد اپنے علم و مہارت، صنعت اور کاریگری کے لحاظ سے مافوق البشر ہستیاں تھیں اور جنہوں نے اس پر سب سے پہلے پرواز کی۔ وہ بلاشبہ بلند ہمتی، عزم اور جرأت کے اعتبار سے قابل داد اور لائق تحسین ہیں۔ لیکن اب ذرا ان مقاصد کا جائزہ لیجیے جن کے تحت یہ ہوائی جہاز استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ مقاصد کیا ہیں؟ فضائے آسمانی سے بمباری، انسانوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا، زندوں کا گلا گھونٹنا، انسانی جسموں کو جلا دینا، زہریلی گیسوں کا پھینکنا اور ان کمزوروں کو ریزہ ریزہ کرنا جن کے پاس اس آفت سے بچنے کا کوئی سامان نہیں۔ یہ مقاصد یا تو احمقوں کے ہو سکتے ہیں، یا شیاطین کے۔" (صـ ۲۶۳)

پروفیسر جوڈ نے قوم پرستی کی ستم رانیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ عہد حاضر کا امپیریلزم اسی قوم پرستی کا شاخسانہ ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

"قومی عظمت کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے پاس ایسی طاقت ہو جس سے وہ بوقت ضرورت اپنی خواہش کو دوسروں سے بالجبر منوا سکے۔ یہ امر کہ قومی عظمت اخلاق سے بالکل بے تعلق ہو ایک ایسا آئیڈیل ہے جس کو کبھی بھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اگر کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک ایسا ہے جو صرف سچ ہی بولتا ہے، وعدے وفا کرتا ہے اور کمزوروں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرتا ہے تو ان قوموں کے نزدیک اس کی کوئی عزت نہیں۔ مسٹر بالڈون کے قول کے مطابق عزت نام ہے اس قوت کا جس سے قوم خاص شرف و اعتبار کی مالک ہو، اور دوسروں کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور ظاہر بات ہے کہ ایسی قوت جس سے قوم کو ایسا اعزاز و امتیاز حاصل ہو موقوف ہے آتش فشاں گولوں اور بموں پر، ان نوجوانوں کی وفاداری اور وطن دوستی پر جن کا شہروں پر ان گولوں اور بموں کو پھینکنا محبوب مشغلہ ہے۔ پس جس عزت کے لیے کسی قوم کی تعریف کی جاتی ہے وہ ان صفات و اخلاق کے بالکل ضد واقع ہوتی ہے جن کی بنا پر فرد کی تعریف کی جاتی ہے، میرے نزدیک تو قوم کو اسی قدر وحشی اور غیر مہذب سمجھنا چاہیے جس قدر وہ ایسی عزت کی مالک ہو، فریب دہی، دغا بازی اور ظلم سے عزت حاصل کرنا کسی انسان اور قوم کے لیے قطعاً باعث عزت نہیں۔"

پھر اپنی اپنی قوموں کو سرگرم عمل رکھنے کے لیے اُن کے رہنما نہایت ہی عیاری سے اُن کے دلوں میں دوسری قوم کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکاتے رہتے ہیں۔ انہیں یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ قوم پرستی کا جوش اُس وقت تک قائم نہیں رکھا جا سکتا جب تک کہ قوم کے سینہ میں نفرت اور خوف وہراس کو اچھی طرح پالا نہ جائے۔ چنانچہ پروفیسر جوڈ نے اس کی جو فلسفیانہ اور نفسیاتی تحلیل و توجیہ کی ہے وہ حسب ذیل ہے :-

"وہ مشترک جذبات جن کو بڑی آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لیے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لیے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کریں جس سے وہ نفرت کرے اور اس کے لیے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کریں جس سے وہ ڈرے۔ میں اگر قوموں کو متحد کرنے کا عزم رکھتا ہوں تو مجھے چاہیے کہ میں اُن کے لیے کسی اور سیارہ پر کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دشمن تلاش کرو ں . . . . . مثلاً چاند پر . . . . . جن سے یہ سب قومیں خائف ہوں ،
انہی جذبات پر حکمرانوں کی زندگی موقوف ہے اور انہی جذبات پر قومی اتحاد کی بنیاد" ۔ (ص ۱۵)

آج کل دنیا کی سیاسی فضا میں اتحاد اور امن کے جو نعرے لگائے جا رہے ہیں انہیں وہ ایک خوفناک فریب سے تعبیر کرتا ہے ۔ اس صلح پسندی کو وہ ڈاکو کی صلح پسندی خیال کرتا ہے جو اپنا قدیم پیشہ ترک کر چکا ہے اور اپنے سابقہ مال غنیمت سے عزت اور جاہ حاصل کر چکا ہے ۔ وہ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو اس کے قدیم پیشہ کو اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔

فاضل مصنف نے صرف مغربی تہذیب کی ناکامیوں کا تذکرہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اس کے اسباب کا بھی نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے ۔ اس سلسلہ میں وہ کہتا ہے :۔

"اس وقت نوع انسانی کے سامنے صنعتی تعلیم کا مسئلہ نہیں ، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس نے سائنس سے جو قوت حاصل کی ہے اسے وہ کیونکر صحیح طور پر استعمال کرے ۔ اس الجھن کو سائنس حل نہیں کر سکتی ۔ لہٰذا میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ تہذیب جدید کے پیش نظر اس وقت قوت کا مسئلہ نہیں بلکہ اخلاق کا مسئلہ ہے ۔ اخلاقی پیمانوں سے ہی ہم انسانی ترقی کا صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ جہاں تک انسان کے حیاتیاتی پہلو کا تعلق ہے اس میں مزید ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ۔ مگر اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ابھی اس کے بیشمار امکانات ہیں ۔" (ص ۲۵)

چنانچہ اس نے "وقت کی اہم ضرورت" پر بحث کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ :۔

"دور جدید کا بیمار انسان جس امرت رس کو حاصل کرنے کے لیے آوارہ و سرگردان ہے وہ ایک ایسا مذہب ہے جو ایک طرف تو اسے اخلاق کی معروضی قدریں دے ، اور اس کے ساتھ ہی اسے ان سے عملی زندگی میں فائدہ اٹھانا بھی سکھائے ۔ انسانیت کی کامیابی اسی سے وابستہ ہے ۔"

© rasailojaraid.com